رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم
امن و اخوت کے عظیم داعی
صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری
ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل
کراچی ------ اسلام آباد

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم

امن و اخوت کے عظیم داعی

صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری

تقسیم کار

المختار پبلی کیشنز

۲۵ رجاپان مینشن، ریگل صدر، کراچی

نام .... رحمتِ عالم، امن واخوت کے عظیم داعی

تحریر .... صاحبزادہ سید وجاہت رسول قادری

سن اشاعت.......... 1422ھ/2002ء

صفحات 40

نگران اشاعت... اقبال احمد اختر القادری

کمپوزنگ.......... المختار کمپوزنگ،فون:7725150

ھدیہ .... 12/= روپیہ

ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل

کراچی: آفس:25 جاپان مینشن، ریگل چوک، صدر کراچی، (74400)، پوسٹ بکس نمبر 489

ٹیلی فون نمبر: 021-7725150، فیکس: 7732369

اسلام آباد: D-44/4، اسٹریٹ نمبر 38، سیکٹر F-6/1، اسلام آباد 44000،

ٹیلی فون نمبر: 051-2825587

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحمت عالم ﷺ

امن واخوت کے عظیم داعی

ابتدائیہ:

''اسلام'' سِلم سے ہے جس کے معنی ہے امن وسلامتی ۔اس معنی میں اسلام تمام عالم انسانیت کے لئے امن وسلامتی اوراخوت ومحبت کا ابدی پیغام ہے۔ جواس کے پیغام کوقبول کرلیتا ہے وہ گویا دائمی امن وعافیت کے سائے میں پناہ لیتا ہےاوردوسروں کیلئے بھی امن وسکون اورسلامتی وعافیت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔اسلام کےایک معنی فرماں برداری اوراطاعت کےبھی ہیں۔

اصطلاح شرع میں مندرجہ ذیل بنیادی باتوں کا اپنے زبان وقلب سےقبول کرنے اورتصدیق کرنے کواسلام لانا کہتے ہیں:

ا----اللہ کی وحدانیت ومعبوبیت اورحضوراکرم ﷺ کی رسالت کی گواہی

دینا،

۲----نماز کا قائم کرنا،

۳----زکوٰۃ دینا،

۴----رمضان المبارک کے روزے رکھنا،

۵----صاحب استطاعت کو حج بیت اللہ کے لئے جانا،

ان پانچ باتوں کو ارکان اسلام کہتے ہیں جو شخص ان پانچ باتوں پر عمل پیرا ہو جائے تو پھر وہ پوری زندگی اللہ کی راہ میں جدوجہد اور جہاد میں گزارتا ہے اپنے نفس کے ساتھ جہاد میں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے دشمنوں کے خلاف جہاد ہیں۔ اسلام صرف چند رسومات مذہبی یا عبادات کے ادا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اسلام انسانی زندگی کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے جو حیات انسانی کے مقصد اور نصب العین کے شعور سے لیکر (یعنی اللہ تعالیٰ کی بندگی و عبادت اس طرح کہ اس کے ساری زندگی کا ہر لمحہ اس کے ذکر و فکر میں گزرے اور اس کی رضا جوئی کا متلاشی رہے) اس کے حصول کی حتمی ضمانت تک رہنمائی کرتا ہے۔ جس کی تفسیر رحمۃ اللعالمین سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت مبارکہ میں ملتی ہے جس کو قرآن ''اسوۂ حسنہ'' کہتا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

''بیشک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے'' (الاحزاب ۳۳:۲۱)

اتباع رسول کی اهمیت :

یعنی حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی میں حیات انسانی کا بہترین نمونۂ کمال موجود ہے اور یہ اعلان فرما کر اللہ رب العزت نے اس بات کی تلقین کی ہے کہ آپ کی ذات گرامی قابل اتباع بھی ہے اور واجب الاتباع بھی۔ اسی لئے قرآن مجید ایک اور مقام پر ہادیٔ برحق ﷺ کی نسبت یہ حکم صادر فرماتا ہے:

مَاآتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَانَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

(اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو، اور جس سے منع فرمائیں باز رہو)

(الحشر:۵۹:۷)

کیونکہ سرکار ابد قرار ﷺ کا ہر حکم امر شریعت اور ہر منع نہی شریعت ہے آپ ہی کا قول وفعل اسلام اور اس کی خلاف ورزی اور مخالفت کفر ہے آپ ہی کی سچی اتباع و غلامی حق ہے اور اس سے اس انحراف باطل محض ہے۔ غرض کہ آپ ایسے نمونۂ کمال ہیں کہ دنیوی اور اخروی حیات کی تمام مشکلات کیلئے آپ کی ذات اقدس حل المشکلات ہے۔ آپ کی ذات مبارکہ کے علاوہ کائنات کوئی دوسری ہستی حق و باطل اور ایمان و کفر کے درمیان حدّ فاصل اور سند امتیاز کا درجہ نہیں رکھتی۔ دوسرے الفاظ میں نبوت اپنے علمی و اخلاقی اور روحانی و معجزاتی کمالات کے ساتھ ایک ایسے انتہائی مقام پر آ گئی کہ جس کا تصور کسی انسانی عقل و شعور سے ماوراء ہے اور یہ کہ انسانیت، بشریت اور نورانیت الغرض مخلوقیت کے دائرے میں نہ علمی و اخلاقی اقدار کا کوئی درجہ باقی

رہا، نہ روحانی و معجزاتی کمال کا کوئی مرتبہ کہ جس کے لئے نبوت وجودِ محمدی ﷺ سے گزر کر آگے بڑھے اور نمونۂ کمال کا کوئی دوسرا ''پیکرِ اتم'' معرضِ وجود میں لا سکے۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسٰی ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

بناء بریں حضور اکرم ﷺ کی ذات نہ صرف مرجعِ امت محمدؐیہ بلکہ مرجعِ عالمِ انسانیت بلکہ مرجعِ انبیاء و رسل قرار دی گئی ہے۔

قرآن مجید فرقان حمید نے سرکار دو عالم ﷺ کے ابدی نمونۂ کمال ہونے کی بناء پر حضور ﷺ کی اتباع کو اپنی اتباع قرار دیا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا اَرْسَلْنٰكَ حَفِيْظاً

(جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ ہی کا حکم مانا اور جس نے منہ پھیرا تو ہم نے تمہیں ان کے بچانے کو نہ بھیجا)

(النسا:۴:۸۰)

یعنی جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی اس نے یقیناً اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے حضور اکرم ﷺ کے حکم سے روگردانی کی وہ برباد ہوا اور اس کو تباہی و بربادی سے بچانا حضور اکرم ﷺ کے فرائض نبوت سے نہیں۔ اسی تصور کو حدیث مبارکہ میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

فَمَن اَطَاعَ مُحمداً فقد اطاع الله و من عصٰی

محمداً فقد عصی اللّٰہ و محمدفرقٌ بین النّاس

(صحیح بخاری، ترمذی، دارمی وغیرہ)

(یعنی جس نے آنحضرت ﷺ کی اطاعت کی یقیناً اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی اور جس نے حضور اکرم ﷺ کی نافرمانی کی تو بلاشبہ اس نے اللہ ہی کی نافرمانی کی اور ذات اقدس ﷺ لوگوں یعنی حق باطل کے درمیان فرق و امتیاز پیدا کرنے والی ہے)

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی کہ اس کائنات ہستی میں صرف اور صرف ذات پاک محمد مصطفیٰ ﷺ ہی ''اسوۂ حسنہ'' یعنی نمونۂ کمال کا پیکر اتم ہے۔ اسی کی اتباع باعث فلاح ونجات ہے اور انسان کے مقصد حیات اور نصب العین کے حصول کا واحد ذریعہ اور ضمانت بھی۔ اللہ تعالیٰ کا دینِ اسلام کو بھیجنے اور قران مجید فرقان حمید کو نازل فرمانے کا یہی مقصود ہے۔ یعنی مقصد حیات (اللہ کی بندگی وعبادت) اور نصب العین (اس کی رضا جوئی) حضور اکرم رحمۃ اللعالمین، ھادیٔ برحق ﷺ کی محبت و اطاعت کے ذریعہ حاصل کی جائے۔ اس لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّـا اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِداً وَّ مُبَشِّراً وَّنَذِیراً لِتُؤ مِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِـهٖ وَتُعَـزِّرُوۡهُ وَتُـوَقِّـرُوۡهُ وَتَسَبِّـحُوۡهُ بُکۡرَةً وَّاصِیلاً (الفتح:۴۸:۸-۹)

(یعنی اے نبی! بیشک ہم نے تمہیں بھیجا گواہ (حاضر و ناظر) اور

خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا تاکہ اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور رسول کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی پاکی بولو)

امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''مسلمانو! دیکھو دین اسلام بھیجنے، قرآن مجید اتارنے کا مقصود ہی تمہارا مولیٰ تبارک و تعالیٰ تین باتیں بتاتا ہے:

اول یہ کہ لوگ اللہ اور رسول پر ایمان لائیں

دوم یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کریں

سوم یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت میں رہیں

مسلمانو! ان تینوں جلیل باتوں کی جمیل ترتیب تو دیکھو،

سب سے پہلے ایمان کو فرمایا اور سب میں پیچھے اپنی عبادت کو اور بیچ میں اپنے پیارے حبیب ﷺ کی تعظیم کو۔

اس لیئے کہ بغیر ایمان تعظیم کارآمد نہیں، بہتیرے نصاریٰ ہیں کہ نبی ﷺ کی تعظیم و تکریم اور حضور ﷺ پر سے دفعِ اعتراضاتِ کافرانِ لئیم میں تصنیفیں کر چکے، لیکچر دے چکے مگر جبکہ ایمان نہ لائے کچھ مفید نہیں کہ یہ ظاہری تعظیم ہوئی، دل میں حضور ﷺ کی سچی عظمت ہوتی تو ضرور ایمان لاتے، پھر جب تک نبی کریم ﷺ کی سچی تعظیم نہ ہو، عمر بھر عبادت الٰہی میں گزارے، سب

بیکار و مردود ہے، بہتیرے جوگی (ہندو) اور راہب (عیسائی پادری) ترک دنیا کر کے اپنے طور پر ذکر و عبادت الٰہی میں عمر کاٹ دیتے ہیں بلکہ ان میں بہت وہ ہیں کہ لاالہ الااللّٰہ کا ذکر سیکھتے اور ضربیں لگاتے ہیں مگر ازاں جا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعظیم نہیں، کیا فائدہ؟ اصلاً قابل قبول بارگاہ الٰہی نہیں، اللہ عزوجل ایسوں ہی کو فرماتا ہے:

وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَاعَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰـہُ ھَبَآءً مَّنْثُوراً

''جو کچھ اعمال انہوں نے کیئے ہم نے سب برباد کر دیئے'' (الفرقان ۲۵:۲۳)

ایسوں ہی کو فرماتا ہے:

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ o تَصْلٰی نَاراً حَامِیَةٌ (الغاشیہ ۸۸:۴)

''عمل کریں، مشقتیں بھریں، اور بدلہ کیا ہوگا کہ بھڑکتی آگ میں جائیں گے''

(صفحہ ۱۱ تمہید ایمان با بات قرآن، مطبوعہ مکتبۂ نوریہ رضویہ، سکھر)

اس تفسیر سے یہ بات مزید متحقق ہوئی کہ حق و باطل، ایمان و کفر اور صالحیت و فسق کے درمیان حدّ فاصل اور خطّ امتیاز ذات مصطفوی ﷺ ہے دوسرے یہ کہ مندرجہ بالا آیات اور اس کی تشریح و تفسیر سے تعظیم و توقیرِ رسول مکرم ﷺ اور اتباعِ رسول ﷺ کی ضرورت و اہمیت بھی واضح ہوتی۔ اس سے یہ بات بھی پتہ چلتی ہے کہ چونکہ آپ کی ذات اقدس نمونۂ کمال ہے اس لئے آپ کے قول و عمل سے ثابت ہر حکم میں عالم انسانیت کے لئے حکمت و دانائی، فلاح و نجات اور حیات آفرینی کا پیغام ہے۔ لہذا جو بھی اپنی انفرادی اور اپنے معاشرے اور قوم کی اجتماعی فلاح و نجات، امن و سلامتی کا خواہاں ہے، اس

کے لئے رسول اکرم رحمت عالم ﷺ کی سچی محبت کے جذبے کے ساتھ کامل اتباع و پیروی ناگزیر ہے، لازم ہے۔ اسی بات کی طرف واضح اشارہ سورہ الانفال کی آیت نمبر ۲۴ میں مل رہا ہے۔

يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوااسْتَجِيْبُوْ لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَادَعَاكُم لِمَا يُحْيِيْكُمْ.

''یعنی اے ایمان والو! اللہ اور رسول کے بلانے پر حاضر ہو،
جب رسول تمہیں اس چیز کے لئے بلائیں جو تمہیں زندگی بخشے گی''

اس آیت مبارکہ میں غور طلب بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کے بلانے کو اللہ تعالیٰ اپنا بلانا ٹھہرا رہا ہے۔ ''دَعَاکُم'' میں صیغہ واحد ہے اور اس کی نسبت حضور اکرم ﷺ کی طرف ہے۔

دوسری بات یہ پتہ چلتی ہے کہ مسلمان کسی حال، کسی زمانے میں، یا کسی مقام پر ہو اس پر حضور اکرم سرور عالم ﷺ کی توقیر و تعظیم اور اطاعت و اتباع لازم ہے، چنانچہ بخاری شریف کی ایک حدیث میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ ایک بار حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے کہ جناب رسالتمآب ﷺ نے انہیں پکارا، انہوں نے جلدی جلدی اپنی نماز ختم کی اور پھر سرکار دو عالم ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں حاضر ہوں، آنحضرت ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ ان کے بلانے پر وہ فوراً کیوں نہ حاضر ہوئے، انہوں نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اس پر نبی مکرم ﷺ اس آیت کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ کیا تم نے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نہیں پایا کہ:

''اللہ اور رسول کے بلانے پر فوراً حاضر ہو'' اور اگر تم
نماز ختم کیئے بغیر آ جاتے تو نماز میں ہی ہوتے''
(یعنی نماز جہاں چھوڑی تھی وہیں سے دوبارہ شامل ہو جاتے نماز نہیں ٹوٹتی)

تیسرے یہ کہ قرآن کے ساتھ حدیث یعنی سنت رسول اللہ ﷺ پر بھی عمل ضروری ہے اس کے بغیر فلاح ونجات ممکن نہیں۔

چوتھے یہ کہ محبوب خدا ﷺ کے ہر قول اور ہر فعل میں حکمت و دانائی اور فلاح ونجات کا راز پنہاں ہے لہذا آپ کے ہر حکم پر بلا حیل ومحبت، نہایت محبت وعقیدت، اور مستقل مزاجی کے ساتھ عمل کرنا ہر مومن کے لئے ضروری ہے، قرآن کریم میں بیان کردہ احکام الٰہیہ اور رسول ﷺ کی انہی احکام قرآنی کی اپنے قول وقرار اور عمل سے تشریحات وتوضیحات کے مجموعہ کا نام شریعت ہے جو اسلامی قوانین وتعلیمات کا منبع ہے۔

ایمانی قوت اور زندگی کی اہمیت:

حق یہ ہے کہ حبیب کبریا ﷺ نے عالم انسانیت کو اس زندگی کی حقیقت بتائی اور بتایا یہ کہ ہماری یہ زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور ہمارے لئے ایک امانت ہے۔ اس نعمت سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اور اس بار امانت کو اٹھانے کا اہل ہونے کیلئے ایمان کی قوت کی ضرورت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایمان کی اصل چھ چیزیں قرار دی ہیں:

ا ---- اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا

۲ ---- اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان لانا

۳ ---- اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانا

۴ ---- اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان لانا

۵ ---- قیامت کے دن (یوم جزاء) پر ایمان لانا

۶ ---- تقدیر پر ایمان لانا

کائنات ارض و سما کا ہر وجود اللہ رب العزت نے کسی نہ کسی مقصد کے لیئے پیدا کیا، بلا مقصد تخلیق کرنا شانِ الوہیت کے منافی ہے۔ اس لئے یہ بات کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے پیدا کر کے دنیا میں بھیجد یا گیا ہو۔ چنانچہ قرآن مجید موت و حیات کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے واضح کرتا ہے کہ انسانی زندگی بے مقصد نہیں ہے۔

الَّذِی خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ط وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ (الملک ۶۷:۲)

(وہ جس نے موت اور زندگی پیدا کی کہ تمہاری جانچ ہو تم میں کس کا کام زیادہ اچھا ہے اور وہی عزت والا بخشش والا ہے)

اس آیت مبارکہ سے صاف ظاہر ہے کہ عملی جدو جہد کیلئے کوئی نہ کوئی مقصد اور نصب العین کا ہونا ضروری ہے، جس کے حصول کی ترغیب دی جاتی ہے اور اس کے مطابقت یا عدم مطابقت کے لحاظ سے جدو جہد کرنے والوں کے اعمال کا مقام متعین ہوتا ہے کہ آیا وہ کامیاب رہے یا ناکام۔

انسانی زندگی کا نصب العین رضائے الٰہی کا حصول ہے:

قرآن وسنت کے عمیق مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی انفرادی زندگی کا مقصد اور نصب العین اللہ کی عبادت میں رہ کر رضائے الٰہی کا حصول ہے، انسان، انسان کا غلام نہیں ہوسکتا، غلامی اور بندگی اگر انسانوں کی ہوتو وہ ایک لعنت ہے، لیکن اگر یہ اللہ کی ہوتو ایک نعمت عظیمہ ہے، اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دتیا ہے آدمی کو نجات

لہذا عبدیت اور بندگی صرف اس قادر مطلق ذات یکتا و بے ہمتا کے حوالے سے ہے کہ جس نے جن وانس اور تمام کائنات کو پیدا فرمایا اور اپنی طرح طرح کی نعمتوں سے ان کو نوازا، جس نے انسان کو کائنات میں اشرف ترین مخلوق بنایا اور افضل ترین مقام عطا کیا۔ جس نے انسان کو اپنا نائب بنا کر خلافت ارضی سے سرفراز کیا۔ اس نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری تخلیق کا مقصد بھی بتادیا کہ جن اور انسانوں کو صرف اس لیئے پیدا کیا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں:

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ مَا أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَا أُرِيْدُ أَنْ يُّطْعِمُوْنِ

(الذاریات:۵۱:۵۵تا۵۷)

(اور سمجھاؤ کہ سمجھانا مسلمانوں کو فائدہ دیتا ہے اور میں نے جن اور

آدمی اتنے ہی لئے بنائے کہ میری بندگی کریں، میں ان سے کچھ
رزق نہیں مانگتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے کھا نا دیں)

اس آیت نے بڑی صراحت سے انسانی زندگی کا مقصد اور اس کی غرضِ تخلیق بیان کر دی، کہ انسانون کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی کسی اپنی حاجت کیلئے نہ تھا کیونکہ وہ ذات تو بے نیاز وغنی و رزاق ہے اسے کسی لحاظ سے بھی کسی مخلوق کی کوئی حاجت اور ضرورت تھی نہ ہے۔ اس نے انسانون اور جنوں کو پیدا کیا تو صرف اس لیئے کہ وہ اس کی بندگی کے اخلاقی کمال کو حاصل کر سکیں۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم:

عبادت کا اسلامی مفہوم بہت وسیع ہے، اسلام میں عبادت کا معنی محض پوجا پاٹ، اور رسمی عبادات کا ادا کر لینا نہیں ہے۔ اسلامی فلسفے کے اعتبار سے عبادت ایک جامع لفظ ہے اس میں وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال و اقوال داخل ہیں جو اللہ کو پسند ہیں اور جو اس کی اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ، حج، سچائی، حق گوئی، امانت، دیانت، وعدہ وفائی، مخلوق خدا کے ساتھ ہمدردانہ سلوک، حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی، نیکی کی تلقین، بدی سے پرہیز، انصاف، اخلاق، اخلاص، صبر وتحمل وغیرہ وغیرہ، دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ایک ایسی زندگی کا تصور پیش کرتا ہے جس میں اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی عبادت و بندگی سے عبارت ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب یہ تسلیم و رضا کے ساتھ بسر کی جائے اس صورت میں اس کا کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا

پھرنا، شادی بیاہ، تجارت، ملازمت اور دیگر معاملات زندگی بھی عبادت میں شمار ہوں گے۔ اسلام نے اسی جامعہ عبادت اور بندگی کا مفہوم مندرجہ ذیل آیات مبارکہ میں پیش کیا ہے:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ج وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ٥

(البقرہ ۲:۱۷۷)

"کچھ اصل نیکی (یعنی عبادت) یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو، ہاں اصل نیکی یہ کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیر اور سائلوں کو اور گردنیں چھڑانے میں، اور نماز قائم رکھے اور زکوٰۃ دے اور اپنا قول پورا کرنے والے جب عہد کریں اور صبر

والے مصیبت اور سختی میں اور جہاد کے وقت، یہی ہیں جنہوں
نے اپنی بات سچی کی اور یہی پرہیز گار ہیں''

اس آیت بالا میں مذکورہ تمام خصائل کا مجموعہ نیکی اور اصل عبادت ہے گویا اصل بندگی ایک کُل کا نام ہے اور زندگی کے جملہ معاملات، دنیوی یا اخروی ہوں اس کے تابع ہیں۔ لہذا کامل عبادت اور بندگی یہ کہ انسان پوری زندگی اس طرح بسر کرے جیسے اس کے خالق کی مرضی اور رضا ہو۔ اگر اس نے کچھ معاملات زندگی رضائے الٰہی کے مطابق گزارے اور کچھ اس کے برخلاف تو اس کو ''کامل عبادت'' یا ''کامل بندگی'' سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔ اور ایسا شخص چونکہ اپنے مقصد حیات کو سمجھنے اور اس کے نصب العین کو حاصل کرنے سے قاصر رہا اس لئے دونوں جہاں میں ناکامی اس کا مقدر ہوگی۔

اہل حق اور اہل رضا کی دوستی :

اس کے برخلاف ایسے لوگ جن کے پیش نظر ہمہ وقت اپنی زندگی کا نصب العین ہوتا ہے اور وہ اپنی تمام زندگی تسلیم و رضا میں بسر کرتے ہیں اور کسی لمحہ رضا الٰہی کے حصول سے غفلت نہیں برتتے تو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنا محبوب بندہ اور مقصودِ خلائق بنا دیتا ہے۔ قرآن حکیم اس حقیقت کی تائید یوں کرتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:۳:۳۱)

''اے محبوب تم فرما دو کہ لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے

ہوتو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا''

جن اہل صدق و صفا نے رضائے الٰہی کو مقصد حیات بنا کر اپنے صبح و شام اسی رنگ میں ڈھال دیئے ہیں قرآن ان سے بھی خصوصی لگاؤ رکھنے اور ان کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ ان کی صحبت و معیت سے مقصدِ حیات اور نصب العین کا شعور اور ہدایت کا نور نصیب ہوتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یَآ اَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوااتَّقُوااللّٰہَ وَکُوْنُوامَعَ الصَّادِقِیْنَ (التوبہ:۹:۱۱۹)

''اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو''

یعنی صدق والے ہی رضائے الٰہی کے طلبگار ہیں اخلاص فی اللہ کے ساتھ، اور حقیقت میں وہی راہ ھدایت پر ہیں، انہی کے دل شمع ھدایت سے منور ہیں اور انہی کی راہ صراط مستقیم ہے اور انہی کی پیروی منزل مقصود تک رسائی کی حتمی ضمانت ہے۔

اسی لئے باری تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں ''اِھْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ'' کے الفاظ کے فوراً بعد اس دعا کو مشخص، معین اور نتیجہ خیز کرنے کیلئے ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَاالضَّآلِّیْنَ'' کے الفاظ تعلیم فرمائے ہیں تا کہ راستہ کا تعین ہو جائے۔

یعنی اے باری تعالیٰ ہم کو اپنے نصب العین کے حصول اور مقصد حیات کی تکمیل کیلئے اسی راستے پر چلا جس پر تیرے انعام یافتہ بندے چلتے رہے۔

حصول نصب العین کا طریق کار:

حضور اکرم ﷺ تمام انس و جن کیلئے ایک مکمل دین لے کر آئے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَاللّٰہِ الْاِسْلَامُ (ال عمران ۳:۱۹)

''بیشک اللہ کے یہاں اسلام ہی دین ہے''

''اَلدِّیْن'' سے مراد وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کیلئے اتارا ہے اور جو بندوں کو اللہ کی کامل اطاعت میں زندگی گزارنے کا لائحۂ عمل عطا کرتا ہے جس کا کامل ترین نمونہ حضور اکرم نبی محترم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ اسلام ایک دین فطرت اور عالمگیر دین ہے اس میں لوگوں کی انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی معاملات کیلئے مکمل طریقۂ کار موجود ہے:

۱- اللہ کی حاکمیت اور عقیدہ توحید کا تصور:

اسلام کا پہلا اور اساسی عقیدہ توحید اور تمام معاملہ میں اللہ بزرگ برتر کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ دوسرے سارے عقائد اور اعمال اسی پر مبنی ہیں۔ اگر توحید اپنی حقیقی صورت میں موجود ہے تو رسالت، وحی اور آخرت پر ایمان بھی درست ہے، اور نماز و روزہ، حج و زکوۃ جیسے اعمال بھی نتیجہ خیز اور ثمر آفریں ہیں۔ قرآن پاک میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سب سے زیادہ آیات توحید ہی کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ اسلام جن عقائد و افکار کی بنیاد پر نظام زندگی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے اس کی حقیقی روح توحید ہی ہے، توحید کی بہت سے فلسفیانہ اور عارفانہ تشریحات سے قطع نظر، سادہ زبان میں

اس کا مطلب یہ ہے کہ قولاً اور عملاً اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور جاننا، اور اللہ کی حاکمیت اور اطاعت کو اس طرح اپنے جسم و جاں پر طاری کرنا کہ کوئی لمحہ اس کے ذکر و فکر سے خالی نہ ہو اور کوئی فعل رضائے الٰہی کے خلاف سرزد نہ ہوا اور ہر وقت رضائے الٰہی کا جویا رہے۔ اسی تصور کے ساتھ اسی کی عبادت کرے اسی کے سامنے جھکے، اسی سے مدد مانگے، اسی کو خالق و مالک مانے، اسی کو نفع و نقصان کا مختار مانے، اسی کے قانون کو قانون مانے اور دنیا کے تمام قوانین کو اس کے آگے باطل جانے۔ اسی معنی مفہوم کو اپنی پوری وسعت کے ساتھ قرآن پاک نے یوں بیان کیا ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○ (البقرہ ۲:۱۶۳)

''اور تمہارا معبود ایک معبود ہے اس کے سوا کوئی
معبود نہیں مگر وہی بڑی رحمت والا بڑا مہربان''

قرآن حکیم نے ایک اور مقام پر توحید کو اساسی مسئلہ قرار دیکر اس عقیدے کے حق میں بڑے واضح اور نہایت معقول دلائل پیش کیئے ہیں اور یہ کہہ کر شرک کی تمام راہوں کی مسدود کر دیا ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لا حُنَفَآءَ (البینہ ۹۸:۵)

''اور ان لوگوں کو تو یہی حکم ہوا ہے کہ اللہ کی بندگی کریں
نرے اسی پر عقیدہ لاتے ایک طرف کے ہو کر''

اس آیت مبارکہ میں یہ بتایا گیا کہ خالص توحید یہ ہے کہ انسان اس کی ذات اور اس کی صفات میں بھی کسی کو شریک نہ ٹھہرائے کیونکہ اس کی ذات

وصفات بے مثل ہے، وہ یکتا ہے، بالکل پاک ہے اور تمام عیوب سے مبرّا اور تمام نقائص سے منزّہ ہے۔ خیال رہے کہ اللہ رب العزت کے لئے مذکورہ بالا عقائد اور دیگر اسلامی عقائد کا رکھنا ''اخلاص فی الدین'' ہے اور کفر و شرک اور کفار و مشرکین سے دلی بیزاری، صورت و سیرت و اعمال میں ان سے علیحد گی ''حنفیۃ'' ہے۔

الغرض توحید ایک ایسا عقیدہ ہے جس کی ضرورت و افادیت ہر دور میں رہی ہے اور ہر دور میں رہے گی۔ تمام انبیاء کرام اور رسولان عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بعثت کا مقصد اسی کو قرار دیا ہے۔ یہ ایک خاص نصب العین کا نام ہے اور خاص تصور حیات سے عبارت ہے۔ اس سے فرد اور معاشرے کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی اور روحانی غذا حاصل ہوتی ہے۔ اس عقیدۂ و تصور سے انسانی فکر و عمل میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے۔ اس کا ماننے والا مومن کہلاتا ہے مومن کو صرف اللہ پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اس کا توکّل اس میں ایسی طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اسے خوف زدہ نہیں کر سکتی اور نہ کسی حرص میں اسے مبتلاء کر سکتی ہے وہ سارے انسانوں کے ساتھ باہمی محبت اور احترام انسانیت کے جذبے کے ساتھ پیش آتا ہے اور تمام مخلوق خدا سے شفقت و ہمدردی کا برتاؤ کرتا ہے انسانی کردار کی بلندیاں اور اخلاق کا کمال اسی عقیدہ کا مرہون منت ہے جو نظام زندگی اس پر قائم کیا جائے گا وہ یقیناً ہر اعتبار سے ارفع و اعلیٰ ہوگا۔ ہر ایک کے لئے امن و عافیت کا گہوارہ ہوگا۔

۲-ایمان بالرسالت :

ہمیں عدم سے شہود میں لانے والے اور زندگی بخشنے والے اللہ رحیم و کریم عزّ وجلّ نے جہاں ہماری فطرت کے ہر تقاضے کی تکمیل کا سامان اس کائنات ہست و بود میں مہیا کر رکھا ہے اس نے اس رہبری و رہنمائی کا بھی انتظام فرمایا ہے جس کی ضرورت ہمیں اپنے مقصد حیات کی تکمیل اور نصیب العین کے حصول میں پڑتی ہے۔

خالق ارض وسماء نے اپنے منتخب، استفیٰ اور مصطفیٰ، بندوں کو رسول اور نبی بنا کر مبعوث کیا اور ان کے ذمے یہ خدمت کی کہ وہ اللہ کے عام بندوں کو آگاہ کر دیں کہ اللہ کی وحدانیت اور رسول کی رسالت پر ایمان رکھنے والے اس دنیا میں اور اس کے بعد ابد الآباد تک امن وسکون اور مسرت وشادمانی کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکیں گے۔ نیز یہ کہ وہ اگر یہ کامیابی چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تمام اعمال یہاں تک کہ اپنی فکر اور ذہن کو اس فکر کے مطابق بنانے کی کوشش کریں۔ اللہ کا یہی پیغام بندوں تک پہنچانے کو رسالت کہتے ہیں یہ کسبی نہیں بلکہ وھبی یعنی اللہ کی وحی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے اور اللہ جسے چاہے عطا فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (البقرہ:۲:۱۰۵)

''اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے''

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو اس بات کا بھی پابند بنایا کہ لوگوں کو پوری وضاحت کے ساتھ یہ سمجھا دیں کہ اس دنیا کو اور اس میں آباد انسان

جنوں کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور اس نے یہ بھی طے کر دیا ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کیلئے کس طریقہ کار سے یہاں زندگی گزارنی ہے اور اس دنیا اور اس میں بسنے والی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یہ بتایا گیا کہ اس کارگہِ حیات میں خیر و صلاح، اور سعادت و فلاح کی راہ کون سی ہے اور اس روشن راہ کو ترک کر کے خودساختہ طریقہ پر چلنے والے کا انجام کیا ہوگا۔

اسی بناء پر اللہ نے اپنے پیغمبروں، کو بشیر و نذیر کہا ہے یعنی راہ مستقیم پر چلنے والوں کو اچھے انجام کی خوشخبری دینے والے اور کج روی اختیار کرنے والوں کو انجام بد سے ڈرانے والے۔ قرآن مبارک رسالت کی ضرورت بتاتے ہوئے یوں کہتا:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ج (البقرہ۲:۲۱۳)

''لوگ ایک دین پہ تھے، پھر اللہ نے انبیاء بھیجے، خوشخبری دیتے اور ڈر سناتے اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری، کہ وہ لوگوں میں ان کے اختلافوں کا فیصلہ کر دے اور کتاب میں اختلاف

انہیں نے ڈالا جن کو دی گئی تھی بعد اس کے کہ ان کے پاس
روشن حکم آ چکے، آپس کی سرکشی سے"

اس آیت کا مفہوم کسی تشریح و توضیح کا نہ متلاشی ہے نہ محتاج لیکن اس وقت جس خاص بات کی طرف اشارہ مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارا حال بعینہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق اُن افراد اور اقوام کا تھا جنہوں نے ہم سے پہلے محض اپنے ذاتی مقاصد اور مفادات کی تکمیل کیلئے ہدایت ربانی سے واقف ہونے اور اس پر ایمان لے آنے کے باوجود انہیں پس پشت ڈال دیا تھا اور آپس میں اختلاف و افتراق اور سرکشی میں مبتلاء ہو چکے تھے۔

اس میں ہمارے لیئے یہ سبق ہے کہ سابقہ امتوں کیلئے تو یہ موقع تھا کہ جب وہ حق کو اس طرح فراموش کر دیتی تھیں تو ان کی اصلاح کیلئے اور نہیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے دوسرے نبی و رسول تشریف لاتے تھے۔ لیکن خاتم النبیین ﷺ کے ورود مسعود کے بعد اب تمام انسانیت کے لئے تا قیامت یہ راستہ بند ہے۔ اس لئے امت مسلمہ کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے اور اپنی نبی کی تعلیمات کو یاد رکھنا ہم پر بدرجہ اُتم فرض ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت، ان کی تعظیم اور ان کی اتباع فرض عین ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ
الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(الاعراف:۷:۱۵۷)

''تو وہ جو اس پر (یعنی رسول اللہ ﷺ پر) ایمان لائیں اور اس کی تعظیم کریں اور اسے مدد دیں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ اترا، وہی با مراد ہوئے''

اس آیت مبارکہ میں فلاح پانے والوں کی چار شرائط بیان کی گئی ہیں:

اول، حضور نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا

دوم، آپ ﷺ کی تعظیم کرنا

سوم، آپ ﷺ کی مدد کرنا

چہارم، قرآن کریم اور حضور ﷺ کی سنت کی اتباع کرنا۔

ہمارا عقیدۂ رسالت مطالبہ کرتا ہے کہ ہم حضور اکرم ﷺ کی محبت کے ساتھ ساتھ آپ کی تعلیمات اور آپ کی ان ہدایات پر جن پر ہم ایمان کے مدعی ہیں دل و جان سے عمل کرنے پر کمربستہ ہو جائیں۔ مندرجہ بالا آیت کریمہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ایمان بالرسالت، اقرار و تصدیق کی شرط پوری کرنے کے علاوہ درج ذیل چار بنیادی تقاضوں کی تکمیل کا نام ہے:

۱ .... محبت رسول ﷺ

۲ .... تعظیم رسول ﷺ

۳ .... نصرت رسول ﷺ اور

۴ .... اتباع رسول ﷺ

حضور اکرم ﷺ نے اپنی مکمل غلامی اطاعت و اتباع کو ایمان کی شرط لازم قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لایؤ من احد کم حتی یکون ھواہ تبعاً لماجئت بہ

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی تمام خواہشات کو میری تعلیم کے تابع نہ کردے''

روح ایمان مغزِ قرآں جانِ دیں
ہست حبِّ رحمۃ اللعالمین

۳-تزکیۂ نفس:

سرورِ کائنات علیہ التحیہ والثناء کی رسالت ابدی اور عالمگیر ہے۔آپ کو صرف آیات قرآنی سنا دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نہیں بھیجا۔ بلکہ آپ کی بعثت کے تین مقاصد اور بھی تھے۔ایک یہ کہ آپ لوگوں کو اللہ کی وحدانیت اور بندگی کی تعلیم دیں، دوسرے یہ کہ کتاب اللہ (القرآن) کے منشا کے مطابق زندگی گزارنے اور کام کرنے کی حکمت سکھائیں اور تیسرے یہ کہ آپ افراد اور ان کی ہیئت اجتماعی کا تزکیہ کریں، اجتماعی مفاسد کو مٹا کر صلاح وفلاح کی فضاء پیدا کریں۔اگر کتاب وحکمت کی تعلیم صرف آیات کے سنا دینے تک محدود ہوتی تو تزکیہ کا علیحدہ ذکر بے معنی ہوتا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْمَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْبَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج (آل عمران:۳:۱۶۴)

''بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں

میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے''

انسان اپنی تخلیق کے اعتبار سے ایک بے غبار آئینہ (نفس) کے ساتھ پیدا ہوتا اس کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین:۴)

''بیشک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا''

یعنی ہم نے انسان کو ہر لحاظ سے، صوری و معنوی دونوں اعتبار سے، بہترین پیمانے پر تخلیق کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا نفس حقیقت میں ایک بے غبار آئینہ ہے لیکن زندگی کے تقاضے اور اس کے مسائل جو ان گنت اور بے شمار اور مختلف النوع ہیں، ان کی تکمیل کی تگ و دو انسان کو ہمہ وقت اس گرد وغبار کے زیر اثر رکھتی ہے جو اس آئینے کو گدلا دیتا ہے۔ اس لئے کہ انسان اپنی شعوری زندگی کے ہر لمحے میں تین قسم کے حقوق ادا کرتے رہنے کا پابند ہے:

۱ - حقوق اللہ

۲ - حقوق العباد

۳ - حقوق النفس

کارِ دنیا کی انجام دہی کی اس تگ و دو میں آدمی تینوں قسم کے حقوق کی ادائیگی میں وہ توازن قائم نہیں رکھ سکتا جو اگر قائم رہے تو آئینہ دل کی صفائی میں فرق نہیں آسکتا۔ یہ فضیلت صرف انبیاء کرام اور رسولان عظام صلوٰۃ اللہ و سلامہ علیہم کے حصے میں آئی ہے۔ دراصل ان تینوں حقوق کی ادائیگی میں ہر

کوتاہی آئینہ دل کو زنگ آلود کردیتی ہے۔اس سے ظاہر ہوا کہ ہر انسان کے اندر خلقاً اقرار الوہیت، فجور وتقویٰ میں امتیاز، بصیرت نفس اور امانت داری کا احساس موجود ہوتا ہے اس احساس کو فطرت سلیمہ بھی کہتے ہیں، مسند امام احمد اور بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں اس کا واضح اشارہ موجود ہے:

کلُّ مولودٍ یُولَدعلی الفطرۃِ

''ہر بچہ فطرتِ صحیح پر پیدا ہوتا ہے''

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

مامن مولود یولد الّاعلی الفطرۃ فابوٰہ

یھودانہٗ اوینصرانہٗ اور یمجسانہٗ

یعنی کوئی بچہ ایسا نہیں کہ جو (مذکورہ بالا) فطرت صیحہ پر پیدا نہ ہوتا ہو، بعد میں اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی وغیرہ بنادیتے ہیں۔ دل کی اس زنگ آلودگی سے خود کو بچانا اور اس کی صفائی وجلاء کا ہر وقت خیال رکھنا اور شعوری یا غیر شعوری کوتاہی کی وجہ سے اس پر آجانے والے داغ دھبوں اور کدورتوں کا ذکر وفکر الٰہی سے صاف کرتے رہنا ہی ''تزکیہ نفس'' ہے۔حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ:

اِنَّ ھَذِہِ القلوب لَتَصداء وَجلاءُ ھاذکرُاللّٰہِ

''بیشک انسانی قلوب اس لئے ہیں کہ ان میں زنگ لگ جائے اور ان کی جلاء وصفائی ذکر اللہ سے ہے''

نفس کو کدورتوں سے صاف رکھنے کا یہ عمل اللہ کے نزدیک حصول

فلاح کا ضامن ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (الشمس:۹۱:۹-۱۱)

''بیشک مراد کو پہنچا جس نے اسے (نفس کو) ستھرا کیا

اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا''

یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قدرت نے کائنات کے پورے نظام میں اصلاح کا ارتقائی طریق کار رائج کیا ہے اور تضاد کو ہر جگہ اصلاح کے لئے سازگار شرط کے طور پر پیدا فرمایا ہے، انسان کی انفرادی زندگی کے نصب العین (رضائے الٰہی) کے حصول کیلئے محرک قدرت نے ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے اور وہ محرک ''تزکیۂ نفس کی آرزو'' یا گناہ و معصیت سے پاک وصاف رہنے کی تمنا ہے۔

تزکیہ ''زکا'' سے مشتق ہے زکّٰی یزکی کے معنٰی پاک وصاف کرنے اور نشو ونما دینے کے ہیں اسی سے زکوٰۃ کا لفظ نکلا ہے۔ کہا جاتا ہے زکوٰۃ کی اصل وہ نشو ونما ہے جو برکت الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیئے تزکیۂ نفس کی تعریف امام راغب اصفہانی مفردات میں یوں کرتے ہیں:

''خیرات و برکات کا نفس انسانی میں نشو ونما پانا تزکیۂ نفس کہلاتا ہے''

اس تزکیۂ نفس کے مضمون کو سمجھنے کیلئے نفس انسانی کو ایک روحانی زمین سے بھی مثال دی جاتی ہے۔ اس زمین میں انسان نیکی، اخلاق حمیدہ، فضائل جمیلہ کے پودوں کی کاشت کرتا ہے لیکن چونکہ نفسِ انسانی کی زمین میں برائی اور اخلاق رذیلہ کے چھوٹے چھوٹے خودرو پودے بھی از خود اگ آتے ہیں،

کیونکہ فطرتِ انسانی میں ہر دو رجحانات موجود ہیں، اب نفس انسانی کی قوتیں بجائے نیکی کی نشو ونما پر صرف ہونیکے برائی کی نشو ونما پر بھی صرف ہونے لگتی ہیں ،لہذا نیکی اور تقویٰ کی صحیح پرورش و پرداخت اور نشو ونما کیلیئے ،گناہ و معصیت کے رجحانات سے نفس انسانی کی زمین کو پاک کردینے کا عمل ''تزکیہ نفس'' کہلاتا ہے اسی مفہوم کو قرآن نے ایک اور جگہ یوں ادا کیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (الاعلیٰ: ۸۷:۱۴-۱۵)

''بیشک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا، اور اپنے رب کا نام لیکر نماز پڑھی''

یعنی ''تزکیہ نفس'' کے بعد ''ذکر الٰہی'' کا پودا قلب و باطن میں صحیح نشو ونما پانے لگتا ہے اور اس حال میں پڑھی ہوئی ''نماز'' وصال حق کیلیئے اہل ایمان کی معراج بن جاتی ہے اس لئے ارشاد فرمایا کہ ان شرائط کا پورکرنے والا ''فلاح'' پا گیا۔ غرضکہ اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کا نفس شعوری اور غیر شعوری طور پر غلطیوں، کوتاہیوں اور بے احتیاطیوں کی وجہ سے مکدّر رہوتا رہتا ہے نفس کی اس خرابی پر متوجہ رہنا اور اس کی صفائی سے غفلت نہ برتنا ہی تزکیۂ نفس ہے۔ یہ عمل اللہ کے نزدیک اس قدر اہم ہے کہ اسے انبیاء کرام علیہم السلام کے فرائض منصبی میں شامل فرما گیا ہے۔

اسی لیئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو ان طریقوں کی خصوصی تعلیم و تربیت دی ہے جو تزکیہ نفس کیلیئے ضروری ہیں۔ اسی سنت پر عمل کرتے ہوئے، صحابۂ کرام اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے بھی ''تزکیہ نفس'' کی تعلیم تربیت کا سلسلہ جاری و ساری رکھا، اور پھر ''اھدنا الصراط المستقیم

صراط الذین انعمت علیهم" کی پیروی میں اولیاء کرام کی جماعت نے سلسلہ بہ سلسلہ آج تک اس کو جاری رکھا ہے۔ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

ان نفوس قدسیہ کی تعلیمات اور ہدایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے تزکیۂ نفس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان جو کوتاہیاں حقوق اللہ کی ادائیگی کے بارے میں کرتا ہے انکی تلافی اور نفس پر ان کے برے اثرات کو دور کرنے کی یہ تدبیر کرے کہ اللہ رحمٰن و رحیم سے معافی مانگتا رہے اور عمل استغفار میں برابر مشغول رہے جس کے بار میں خود رحمت عالم نور مجسم ﷺ نے امت کی تعلیم و تربیت کے لئے فرمایا کہ "میں ستر بار صبح اور ستر بار شام استغفار کرتا ہوں" لیکن جہاں تک "حقوق العباد" کے سلسلے میں ہونے والی غلطیوں، کوتاہیوں اور خطاؤں کا معاملہ ہے تو اس کی نوعیت اس کی ضرورت اور اہمیت کے اعتبار سے بالکل جدا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ حقوق العباد کو اس وقت تک معاف نہیں فرماتا جب تک متاثر ہونے والے فرد (یا افراد) سے حساب صاف نہ کرلیا جائے، ایک انسان کے کسی غلط طرز عمل، کسی ناروا سلوک یا کسی زیادتی سے کبھی تو ایک یا چند افراد متاثر ہوتے ہیں اور کبھی ان اثرات کا دائرہ بڑھ کر معاشرے، قوم، ملک اور بسا اوقات ساری انسانیت تک جا پہنچتا ہے، اسی مناسبت سے نفس کی کدورت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اسی تناسب سے تزکیۂ نفس کا کام مشکل تر ہوتا ہوجاتا ہے۔ اس لیئے دوسروں کو اپنے ہاتھ، زبان، قلم، قوت و صلاحیت کے غلط استعمال اور افکار و اعمال کی خرابیوں کے برے اثرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

تزکیہ نفس کا عمل اس بات کا متقاضی ہے کہ اس عمل سے انسان صرف اپنے قلب کے اس گرد وغبار کو ہی صاف نہیں کرے جو حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی وجہ سے قلب و روح کو پراگندہ کرتا ہے بلکہ اس کے اندر اس ضرورت کا احساس بھی پیدا ہو کہ اسے آئندہ زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو دوسرے انسانون اور مخلوق خدا کے لئے حق تلفی، ظلم و زیادتی اور پریشانی کا موجب بنے اور اس کے نتیجے میں اس کے اپنے نفس کو اس طرح داغدار کرے کہ جہنم کی آگ بھی اس داغ کو نہ مٹا سکے۔ آج کے مسلم معاشرے کے بڑھتے ہوئے بگاڑ کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم نے حضور اکرم ھادی اعظم ﷺ کی ''تزکیہ نفس'' کی ان تعلیمات کو یکسر فراموش کر دیا ہے اور ہمارے سینے اس ''قلب مصفّٰی'' کی صفت سے خالی ہو چکے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مطلوب اور محبوب ہے۔

۴......عدل او احسان:

عدل و احسان رضائے الٰہی کے حصول کا ایک اور بنیادی لازمہ ہے اس کا مفہوم سورۂ نحل کی اس آیت سے واضح ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل:۱۶:۹۰)

''بیشک اللہ عدل و احسان (یعنی انصاف اور نیکی) دونوں کے برتنے کا حکم فرماتا ہے''

یہ آیت کریمہ نماز جمعہ کے ہر خطبے میں دہرائی جاتی ہے لیکن بہت کم لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو سمجھتے ہیں اور اس کی افادیت پر غور کرتے ہیں۔ عدل اور احسان ایسے اوصاف ہیں جن کے بغیر کوئی بھی معاشرہ پرامن

اور پر مسرت نہیں رہ سکتا۔ عدل کے لغوی معنیٰ ہیں کہ کسی چیز کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دینا کہ ان میں ذرا بھی کمی بیشی نہ ہو۔ عدل کے یہ معنی بھی بیان کیئے گئے ہیں کہ جس قدر دینا فرض ہو اسی قدر دیا جائے اور جس قدر لینا ضروری ہو اسی قدر لیا جائے ۔ عدل کا خلاف ظلم ہے اور ظلم موجب عذاب الٰہی ہے عدل کے مقابلے میں ایک دوسرا لفظ احسان ہے، احسان کے معنی علماء نے یہ بتائے کہ احسان یہ ہے کہ جس قدر دنیا کسی کو واجب ہو تو اس سے زیادہ دیا جائے اور جس قدر لینا حق ہو اس سے کم میں برضا ورغبت راضی ہو جائے اور ''کمال'' احسان یہ ہے کہ انسان اپنا سارے کا سارا حق دوسروں کیلیۓ قربان کر دے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے ثابت ہے۔

اس آیت مبارکہ کی رو سے عدل و احسان دونوں حالتیں تقاضائے ایمان قرار دی گئی ہیں ۔ عدل و احسان کا یہ مفہوم حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث سے جس کو بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کی ہے، سے بھی واضح ہوتا ہے:

> ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کوئی شخص بھی اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو اپنی ذات کے لیئے پسند کرتا ہے''

عدل کی اصطلاحی معنیٰ یہ ہیں کہ جو بات ہم کہیں یا جو کام ہم کریں وہ حق اور صداقت کی میزان پر پورا اترے۔ غرض اقوال ہوں یا اعمال وہ بہر طور میزان عدل پر پورے اتریں۔ اسلامی معاشرے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس بات کا یقین کامل ہو کہ وہ اپنے حق سے محروم نہیں ہوگا، اور جس کا حق ہے وہ پورا پورا اس کو مل جائے گا ایک مسلمان کے لئے کم از کم شرط یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں عادل ہو یعنی اس حد تک اس کے اندر بے لوثی اور بے غرضی کا جذبہ کارفرما ہو اور وہ معاشرے کے دیگر افراد کے حق میں اس حد تک دردمند، بہی خواہ، نافع اور مفید ہو جائے کہ جو کچھ وہ اپنی ذات کیلئے پسند کرے یا روا رکھے کم از کم وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرے اور ہو سکے تو خلق خدا کو بہم پہنچا کر فائدہ پہنچائے، بالفاظ دیگر اپنے حقوق ومفادات اور دوسروں کے حقوق و مفادات میں کوئی امتیاز و فرق کا تصور نہ رہے۔ یہاں تک کہ حدیث رسول ﷺ کے مطابق اپنے خادم کو بھی اسی معیار کی ضروریات زندگی اور تحسینیاتِ رہائش مہیا کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ اگر یہ احساس اور درد معاشرے میں مفقود ہو اور معاشرے کے افراد کا عمل عدل کے ان خصائص سے عاری ہو تو زندگی خلاف عدل ہے اگر ایک طرف صاحب ثروت تعیّشات کی زندگی بسر کرتا ہو جبکہ اسی معاشرے میں بہت سے افراد دستنگر ہوں اور بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہوں تو یہ عدل کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے اور یہی ظلم ہے اور ظلم منافی ایمان ہے۔ مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ سے بھی عدل کے اس مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے۔

حضرت عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی کے ذریعہ آگاہ کیا کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے'' (مسلم)۔ عدل انسان کو منصف مزاجی کی طرف مائل کرتا ہے اور احسان اس کے اندر ملکوتی صفات پیدا کر کے اس کو معاشرے اور انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد بناتا ہے۔ عدل و احسان دونوں کو تقاضائے ایمان قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ انسان جذبۂ عدل سے گزر کر احسان کیلئے کوشش کرے اگر مقام احسان کے اعتبار سے اس سے کوتاہی سرزد ہوتی ہے تو کم از کم وہ مقام عدل پر فائز رہتا ہے، اس طرح معاشرے کا انفرادی اور اجتماعی توازن برقرار رہتا ہے۔ لیکن اگر وہ صرف عدل کیلئے کوشاں رہے اور اس سے اعلیٰ مقصد اس کی نظروں سے اوجھل رہے تو عدل کے برتنے میں خطاؤ کوتاہی اس کو مقام ظلم پر لا کھڑا کر سکتی ہے جو خود اس کی ذات کیلئے اور معاشرے کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ عملِ احسان انسان کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور انسانیت اور مخلوق خدا کیلئے درد اور محبت کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

محسنین پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نازل فرماتا ہے اور اپنے قرب کی نعمت سے نوازتا ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات اس امر کی طرف واضح اشارہ کرتی ہیں، چند آیات ملاحظہ ہو:

ا.........هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (الرحمٰن:۵۵:۶۰)

(نیکی کا بدلہ کیا ہے مگر نیکی)

یعنی فعل احسان کی جزا (میرے خزانے میں) سوائے احسان کے کچھ اور نہیں

۲........وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (البقرہ:۲:۱۹۵)

(اور بھلائی والے ہو جاؤ بیشک بھلائی والے اللہ کے محبوب ہیں)

۳........اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (التوبہ:۹:۱۲۰)

(بیشک اللہ نیکوں کا نیگ ﴿انعام﴾ ضائع نہیں کرتا)

۴........اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (الاعراف:۷:۵۶)

(بیشک اللہ کی رحمت نیکوں سے قریب ہے)

۵........وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (العنکبوت:۲۹:۶۹)

(اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ضرور ہم انہیں اپنے راستے دکھائیں گے اور بیشک اللہ نیکوں کے ساتھ ہے)

مذکورہ بالا آیا سے مستخرجہ مضامین کی تائید صحیح بخاری کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے اصلاح محدثین میں حدیث جبرئیل کہتے ہیں۔ بارگاہ نبوی ﷺ میں ایک بار جبرئیل امین علیہ السلام نے ایک اعرابی کی شکل میں حاضر ہوکر ایمان اور اسلام کی بابت سوال کیا اور بعد ازاں احسان کے متعلق دریافت کیا۔

ماالاحسان قال الاحسان ان تعبداللہ

کانک تراہ فان لم یکن تراہ فانہ یراک

یارسول اللہ ﷺ احسان کیا ہے آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے (یعنی تو نے اسے پا لیا) اور تو اسے نہ دیکھ سکے (یا نہ پا سکے) تو کم از کم تیری حالت یہ ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

حضرت اوس بن شرجیل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص تقویت حاصل کرنے کیلئے ظالم کا ساتھ دے اور اسے یہ معلوم ہو کہ وہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ (بیہقی)

اس سے ثابت ہوا کہ زندگی کے معاملات میں عدل نہ برتنے والا یا عدل و انصاف کے اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والا ایمان کا ادنیٰ تقاضا بھی پورا نہیں کر رہا ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کر کے عذاب الٰہی کو دعوت دے رہا۔ اسلام میں عدل اور انصاف کو خاص اہمیت حاصل رہی اس لئے کہ اس کے بغیر کوئی معاشرہ پر امن اور صالح معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔ عدل کا فقدان انسانی معاشرے کو جنگل کا معاشرہ بنا دیتا ہے جہاں ظلم و جور، لوٹ گھسوٹ اور جبر و استبداد کا دور دورہ ہوتا ہے۔

احسان:

آیت کریمہ میں دوسری صورت احسان کی بتائی گئی ہے جو عدل سے برتر صفت ہے اگر ''عدل و انصاف'' کا وصف ایک مسلمان کے ایمان کی کم از کم شرط ہے تو ''احسان'' اس کے کمالِ ایمان کا نام ہے۔ عدل و احسان میں فرق

ایثار کا ہے۔ عدل کی حالت میں انسان اپنے حقوق سے دستبردار نہیں ہوتا نہ دوسروں کے حقوق پر دست اندازی کرتا ہے لیکن احسان کے وصف سے موصوف انسان جو کچھ اپنے لیئے پسند کرتا ہے وہی وہ پیکر ایثار بن کر دوسروں کے فائدے کیلئے قربان کر دیتا ہے۔ یعنی عدل کی صورت میں اگر ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر عمل ہوتا ہے تو احسان کی حالت میں دوسروں کے واسطے زندہ رہنے کا جذبہ بدرجۂ تم کارفرما ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث کی شرح میں عام طور پر محدثین کے دو موقف رہے ہیں لیکن ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ''مرقاۃ المفاتیح'' میں اس حدیث میں ''احسان'' کا معنی یہ فرماتے ہیں کہ احسان یہ ہے کہ بندہ اپنی ذات سے بے نیاز ہو جائے، اپنے وجود کو اللہ کی رضا کے لیئے فنا کر دے، چونکہ اس کے اپنے وجود کا احساس اور اس کی اپنی ''انا'' رویت و مشاہدۂ باری تعالیٰ میں مانع ہے۔ گویا ایثار و قربانی کا منتہائے کمال استغنائے نفس اور خود فراموشی ہے اور جو شخص اپنی ذات اور اپنی منفعتوں کے تصور سے بے پروا اور بے نیاز ہو جائے وہی صاحب احسان ہے اور اسی پر رضائے الٰہی، رحمت باری تعالیٰ اور وصال حق کے تمام در کھول دیئے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش ہر پیغمبر کو ''صاحب احسان'' کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ لہذا عملِ احسان، حصول نصب العین کا پیغمبرانہ طریقہ کار رہے۔

عدل و احسان میں ایک بڑا بنیادی فرق یہ حق کہ عدل میں بعض اوقات دلوں کی کدورت دور نہیں ہوتی اور انتقامی جذبہ شیطانی کاموں کی

ترغیب دلاتا رہتا ہے اس کے مقابلہ میں احسان میں بظاہر تو نقصان کا احتمال ہوتا ہے لیکن حقیقتاً اس سے محبت رواداری ہمدردی اور خلوص کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔صدیوں کی نسلی دشمنیاں، دوستی و محبت میں اس طرح تبدیل ہو جاتی ہیں کہ مختلف النسل و زبان افراد ایک دوسرے کیلئے ایک جانِ دو قالب بن جاتے ہیں اور اس خوشگوار ماحول کا نتیجہ امن و سلامتی اور شادمانی و خوشحالی ہوتا ہے۔

غرض کہ احسان کا عمل اور وصف انسانی معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی طور پر تمام اخلاق حمیدہ کے خصائل پیدا فرماتا ہے مثلاً تزکیۂ نفس، تربیتِ نفس، اخلاص نیت و عمل، برائیوں سے اجتناب، تعاون علیٰ الخیر، توکل و قناعت، اتحاد و یگانگت، انفاق فی سبیل اللہ، عفو درگزر، احساسِ اجتماعیت اور اجتماعی صلاح کا نظریہ، غوم خواری و ہمدردی، امانت و دیانت داری، تقویٰ و پرہیز گاری، حلم و بردباری، استقلالِ فکر و نظر، وسعتِ قلبی، شرافت و مروت، احترام انسانیت، ادب و احترام وغیرہ جس کی وجہ سے ایک فرد نفس مطمئنہ کا مالک بن کر دنیاوی زندگی ہنسی خوشی گزارتا ہے اور معاشرے میں چین و سکون، امن سلامتی اور اخوت و محبت کا دور دورہ ہوتا۔افراد ملت دنیا میں امن و سکون کی دولت سے مالا مال ہو جاتے ہیں اور ابدی زندگی میں ''راضیۃً مرضیۃ'' کی تفسیر ہوتے ہیں اور یہی لوگ حصول نصب العین میں کامیاب قرار پاتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم آیت کریمہ:

"یاایھاالذین اٰمنوا استجیبو اللہ وللرّسول اذادعاکم لما یحییکم "

کی روشنی میں حضور اکرم ﷺ کے ''اسوۃ حسنہ'' کے روشن و منور چراغ سے اپنی

زندگی کے فکر ونظر اور قول وعمل کو منور کرلیں کیونکہ یہی وہ نمونۂ کمال ہے جس کی محبت اور اتباع دین ودنیا دونوں میں ہماری سلامتی اور کامیابی کی ضامن ہے۔

بمصطفیٰ بہ رساں خویش راہ کہ دیں ہم اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

کلّ سنۃ وانتم طیبون

ماہنامہ معارفِ رضا کراچی

خود بھی رکن بنئے اور احباب و رشتہ داروں کے نام رسالہ جاری کروا کر چراغ علم جلایئے ۔

سالانہ رکنیت فیس =/120 روپیہ ، تاحیات =/4000 یکمشت ، بیرون ممالک =/10 ڈالر تاحیات =/300 ڈالر یا اس کے مساوی پاکستانی کرنسی رقم بذریعہ منی آرڈر / بینک ڈرافٹ ارسال فرمائیں رسالہ ہر ماہ آپ کے دیئے پتے پر ملتا رہے گا، اپنا پتہ صاف تحریر فرمائیں

رابطہ :- ۲۵، جاپان مینشن، رضا چوک (ریگل) صدر، کراچی ۔ 74400، پوسٹ بکس نمبر 489

فون :- 021-7725150-7771219، اسلامی جمہوریہ پاکستان (E.mail:marifraza@hotmail.Com)